

نیا قانون

۲



یہ سبق پڑھنے کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ:

- کلام/بات کو آغاز/اور میان سے سن کر مرکزی خیال، نکتے یا تصویر تک رسائی حاصل کر کے سیاق و سباق کو سمجھنے اور موضوع کو بیان کرنے کے قابل ہو سکیں۔
- مجازی اور اصطلاحی محضر میں گفتگو کر سکیں۔
- افسانوی وغیرہ افسانوی اقتباسات کو اس کے اسلوب اور بیان کے پیش نظر خاص مقاصد (تفہیم، تجزیہ، موازنہ وغیرہ) کے لیے پڑھ سکیں۔
- مختلف مقاصد کے لیے مرتب دفتری اور عدالتی مواد (مختلف فارم، رجسٹری برائے کرایہ، تقرر نامے، ملازمت کی درخواست، نکاح نامہ، عرضی، عدالتی حکم نامے، ضمانتی چٹکے وغیرہ) پر مبنی متن پڑھ سکیں اور اس کے مقصد تحریر کی اہمیت سے واقف ہو سکیں۔
- مختلف منظوم/منثور اصناف ادب پڑھ کر شعرا/مصنفین کے طرز تحریر پر تبصرہ کر سکیں۔
- کہانی/مضمون/سفر نامے/افسانے، ڈرامے کے اجزاء اور ادبی محاسن کو شناخت کر سکیں۔
- مختلف عبارتیں پڑھ کر ان میں درج معلومات اور تصورات کی پیش کش پر تبصرہ کرتے ہوئے قارئین پر ان کے اثرات کا تجزیہ کر سکیں۔
- مترادف الفاظ کی شناخت کرتے ہوئے تحریر میں برجستہ استعمال کر سکیں۔

پڑھیں



منگو کو چوان اپنے اڈے میں بہت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاماچو دھری کے چوڑے کانڈھے پر تھکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی: ”دیکھ لینا گاماچو دھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔“

جب گاماچو دھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا، ”ولایت میں اور کہاں؟“ اسپین کی جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حقہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سڑک پر تانگہ چلاتے ہوئے کسی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر متمایا ہوا تھا۔ حقہ کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا: ”یہ کسی بھڑکی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور

مسلمانوں میں چاقو، چھریاں چلتی رہتی ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بدعادی تھی: ”جا، تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی، ”یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر ہٹتے رہیں تو کچھ نہ ہو گا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہو گی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت ٹکڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بدعاد بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔“

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنقیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی آجاتی۔ نامعلوم کیوں وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال چھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڑے میں آکر بل مار کر سگریٹ پیتے یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کر ستایا کرتا۔ ”۔۔۔“ یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا، ”آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے بادا کے نوکر ہیں۔“

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا، ”شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی۔۔۔ جیسے کوڑھ ہو رہا ہے۔۔۔ بالکل مردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے ماری ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے۔۔۔“ یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا، ”قسم ہے بھگوان کی ان لاٹ صاحبوں کے نازاٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منہ چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔“

اور جب ایک روز استاد منگو نے پچھری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو پچھری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے، ”سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔۔۔ یاہر چیز بدل جائے گی؟“

”ہر چیز تو نہیں بدلے گی۔ مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی؟“

”کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟“

”یہ پوچھنے کی بات ہے کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔“ ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی

مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا، ”چل بیٹا۔۔۔ ذرا ہوا سے ہاتھیں کر کے دکھا دے۔“

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے اندر کھلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دی کی لٹی پی کر ایک بڑی ڈکاری۔ اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا، ”ہت تیری ایسی تیمی۔“

شام کو جب وہ اڑے کو لوٹا تو خلاف معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔۔۔ بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا لیکن وہاں کوئی تھانی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڑے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹھلٹا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آرہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندستان میں نافذ ہونے والا تھا اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ ”کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟“ بار بار گونج رہا تھا۔ اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مارواڑیوں کو گالی دی۔۔۔ ”غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹل۔۔۔ نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہو گا۔“

وہ بے حد مسرور تھا، خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں۔۔۔ سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھو تھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔

جب تھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڑے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا، ”لا ہاتھ ادھر۔۔۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔۔۔ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اگ آئیں۔“ اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دوران گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ تھو گنجا کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا، ”تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے، یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے رہے گا۔“

استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے اس نے روس والے بادشاہ کو ”انڈیا ایکٹ“ یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا۔ اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ انھیں ”روس والے بادشاہ“ کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں ’روس والے بادشاہ‘ اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں بم ساز پکڑے گئے ہیں۔ یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے۔ تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک، دوسرے سے کہہ رہا تھا، ”جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آسکا۔ فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج

تک نہ سنی نہ دیکھی گئی۔ سیاسی نظریہ سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!“

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس لیے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے کہا، ”یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔“ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا، ”ٹوڈی بچے!“

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں ”ٹوڈی بچہ“ کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور ”ٹوڈی بچے“ کی تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبہ کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا، ”نئے آئین نے میری امیدیں بڑھادی ہیں اگر۔۔۔ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔ تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔“

”ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گزربز میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“

”وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو کی ہوگی۔“

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھادی۔ وہ اس کو ایسی ’چیز‘ سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ ’نیا قانون۔۔۔! وہ دن میں کئی بار سوچتا، یعنی کوئی نئی چیز! اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ ساز آ جاتا۔ جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پٹیل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دکھتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی ’نئے قانون‘ کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی۔۔۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد ہندکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا۔ مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی۔ آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیارنگ دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر سوائے اس کلفی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلفی اس نے نئے قانون کی خوشی میں یکم مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی۔۔۔ ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

”ابھی بہت سویرا ہے دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔“ اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا، ”ہائی کورٹ میں نوبت کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟“

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا۔ تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعوت سے نوبت بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے کیلے کیلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی، کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدمی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ نیاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔۔۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری سے گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہو گا مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس پڑا تھا، ”تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لینے لیٹے بچہ جن دے گی؟“

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی ہنگامی بیوی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی، ”ابھی کنواں کھو دا نہیں گیا اور پیاس سے نڈھال ہو رہے ہو۔“

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا۔ جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا، ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لعل کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلا کرتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا مگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہوا تو استاد منگو کے نزدیک، وہ بڑا آدمی تھا۔ اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں۔ تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا۔ اور دل میں خیال کیا، ”چلو یہ بھی اچھا ہوا۔۔۔ شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔“

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا۔ اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا۔ اور پچھلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا۔۔۔ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی۔ یا اسے کسی میٹے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا۔ تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر

اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تاگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا۔ وہ اس قابل غور بات کو آئین جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک ”گورا“ کھڑا نظر آیا۔ جو اسے ہاتھ سے بلارہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کلفتی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیے ہیں، ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانکا موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا، ”صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟“ اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا، صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھینچ گیا۔ اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نٹھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آرہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی، گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا، اور اپنے اندر اس نے اس ”گورے“ کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب ”گورے“ نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کارخ بچا کر سگرت سٹگار ہاتھ مار کر تانگے کے پاندان کی طرف قدم بڑھایا تو چابک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بند و قوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں گولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے ”گورے“ کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبارہا ہے۔ اور گورے کو کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے، گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگرت کا دھواں نکالتے ہوئے کہا، ”جاننا مانگتا یا پھر گز بڑ کرے گا؟“

”وہی ہے“ یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

”وہی ہے۔“ اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی، اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اسے طوعاً و کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیے ہوتے، مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزاع عام طور کو چوانوں ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے جھپٹے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا، ”کہاں جانا گنا ہے؟“ استاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔ گورے نے جواب دیا۔ ”ہیر امنڈی۔“

”کرایہ پانچ روپے ہوگا۔“ استاد منگو کی مونچھیں تھر تھرائیں۔

یہ سن کر گوراجیران ہو گیا۔ وہ چلا یا۔ ”پانچ روپے۔ کیا تم۔۔۔؟“

”ہاں، ہاں، پانچ روپے۔“ یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونے کی شکل اختیار کر گیا۔ ”کیوں جاتے ہو یا بے کار باتیں بناؤ گے؟“ استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گوراجھپٹے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجار ہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف آکر کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا۔ اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑینا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمت کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی۔ اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں۔ تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس کی چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا، ”پہلی اپریل کو بھی وہی آکر فوں۔۔۔ پہلی اپریل کو بھی وہی آکر فوں۔۔۔ اب ہمارا راج ہے بچہ!“

لوگ جمع ہو گئے۔ اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا اس کی چوڑی چھاتی پھولی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہنپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”وہ دن گزر گئے۔ جب ظلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔۔۔ اب نیا قانون ہے میاں۔۔۔ نیا قانون!“

اور بے چارہ گورہ اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ ”نیا قانون نیا قانون“ چلاتا رہا۔ مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

”نیا قانون، نیا قانون۔ کیا بک رہے ہو۔۔۔ قانون وہی ہے پرانا!“

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

(منگو کے بہترین افسانے)

سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲ء-۱۹۵۵ء)

سعادت حسن منٹو کی پیدائش سمبرالا (لدھیانہ) میں ہوئی۔ اپنے افسانوں کی طرح منٹو کی ذاتی زندگی بھی دل چسپ اور مختصر ہی تھی۔ زمانہ طالب علمی ہی سے ادب میں دل چسپی تھی۔ تعلیمی سرگرمیوں کو اور مورچہ چھوڑ کر عملی زندگی کا آغاز کر دیا۔ غیر ملکی کہانیوں سے تراجم کا جو سلسلہ شروع کیا وہ تخلیقی کہانیوں کی اس انتہا پر پہنچا کہ سعادت حسن منٹو اور اردو افسانہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو، لاہور اور بمبئی کے متعدد فلمی رسالوں کی ذمہ داریاں سرانجام دیں بلکہ فلموں کی کہانیاں بھی تحریر کیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بمبئی کی فضا اور ماحول سے چلائی اور ان کا فن افسانہ نگاری خوب گھر کر سامنے آیا۔ منٹو نے بعض ایسے سماجی اور معاشرتی موضوعات پر نہایت بہادری اور فنی نزاکت سے قلم اٹھایا اور ایسی موثر کہانیاں تخلیق کیں جو صرف منٹو ہی کا خاصا گروائی جاتی ہیں۔ منٹو انسانی زندگی کی مختلف پرتوں، پہلوؤں اور نفسیات سے آگاہ تھے اور اسی آگاہی کو انھوں نے اپنے افسانوں کی ٹریٹمنٹ میں کامیابی سے استعمال کیا۔ اردو افسانہ نگاری کو پُر تکلف زبان سے نجات دلا کر بے تکلفی کی فضا آشا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد سعادت حسن منٹو بمبئی سے لاہور آ گئے لیکن یہاں بھی گردش حالات نے کوئی مثبت اور خوش آئند کروٹ نہ بدلی اور منٹو کی ساری عمر ہی افلاس اور کمپرسی میں گئی۔ منٹو نے زندگی کو ایک باری کی طرح کھینچا اور ہر کچھ بھی جیت گئے۔ اپنی بیس سالہ ادبی زندگی میں اڑھائی سو کے لگ بھگ افسانے اور ایک سو کے قریب ڈرامے تخلیق کیے۔ متعدد فلموں کی کہانیاں، مکالمے، شخصیات کے کاکے اور متعدد مضامین بھی تحریر کیے۔ منٹو کے فن افسانہ نگاری کے بارے میں درست کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بے شمار عقائد، مسلمات اور تصورات کو اپنی بے لاگ اور سفاک حقیقت نگاری سے ریزہ ریزہ کیا یہی وجہ ہے کہ منٹو کہا کرتے تھے کہ میں معاشرے کی بے ہودگیوں اور خرافات ہی کے متعلق لکھتا ہوں۔ منٹو کی بے لاگ اور حقیقت پسندانہ تحریریں بہت سے حلقوں کو ناگوار بھی گزرتی تھیں۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں خیالی کرداروں کی بجائے سماج کے ہر طبقے اور انسانوں کی زندگی کو، نفسیاتی اور جذباتی تہہ داری کے ساتھ متخل کر کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کرنے کی ذمہ داری نبھائی۔ سعادت حسن منٹو کی تخلیقات دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ان کی تصنیفات میں سرگزشت اسیر، ویرانہ (تراجم)، آتش پارے، دھواں، لذت سنگ، چغد، ٹھنڈا گوشت، نمرود کی خدائی، بادشاہت کا خاتمہ سمیت ۲۵ کے قریب ہیں۔ سعادت حسن منٹو نے لاہور میں وفات پائی اور یہیں سپردِ خاک کیے گئے۔ سعادت حسن منٹو کو ”عظیم امتیاز“ سمیت کئی ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔

مشق



۱۔ مصنف کی تکنیک مقصد اور اسلوب پر مبنی درج ذیل سوالات کے جواب دیں۔

- الف۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں کے موضوعات کیا ہیں؟
- ب۔ سعادت حسن منٹو نے اردو افسانے کے ارتقا میں کیا کردار ادا کیا؟
- ج۔ اڈے کے تمام کوچوانوں کے لیے منٹو کی کیا علمی حیثیت تھی؟
- د۔ منٹو کوچوان نے ہندو مسلم فساد کی کیا وجہ بتائی تھی؟
- ر۔ ہندوستان کی آزادی اور غلامی کے متعلق منٹو کی کیا رائے تھی؟
- ہ۔ گورے سے جھگڑا ہونے کے بعد اڈے پہ آکر منٹو کوچوان گوروں کے متعلق کن خیالات کا اظہار کرتا؟
- و۔ تانگے میں بیٹھے والے دو نئے بیرسٹروں کو منٹو نے ”ٹوڈی بیچ“ کیوں کہا؟
- ع۔ ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور پیاس سے نڈھال ہو رہے ہو۔ اس جملے کا مفہوم لکھیے۔

۲۔ تمام طلبہ باری باری اس افسانے کی عبارت کو درست تلفظ، لب و لہجہ، اتار چڑھاؤ اور ضرورت کے مطابق تاثر کے ساتھ پڑھیں اور باری باری اس افسانے سے متعلق اشارات اور اہم نکات بیان کریں۔ آپ یہ اشارات اور اہم نکات سن کر ان کی فہم کا تجزیہ کریں۔

افسانہ ”نیا قانون“ کے مرکزی کردار ”منٹو کوچوان“ کے مکالموں کو دو طالب علم مجازی (ادبی) اور اصطلاحی (علمی) محضر میں گفتگو کے انداز میں پیش کریں۔

سو درج ذیل عبارت کو افسانے کے درمیان سے لیا گیا ہے۔ ایک طالب علم اسے درست تلفظ سے ادا کرے جب کہ باقی طلبہ باری باری سیاق (عبارت کے بعد) و سباق (عبارت سے قبل) کے ساتھ اسے بیان کریں۔

”خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگا موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی بائیں کھچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پیچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا، ”صاحب بہادر کہاں جانا مانگا ہے؟“ اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا، صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھینچ گیا۔ اور پاس ہی گال کے اس طرف جو دم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آرہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی، گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا، اور اپنے اندر اس نے اس ”گورے“ کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔“

لغت میں افسانہ ایک جھوٹی کہانی کو کہتے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں یہ ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جو زندگی کا ایک جزو پیش کرتی ہے۔ افسانہ: اختصار اور وحدت تاثر کی حامل بھی ایک کہانی ہوتی ہے۔ افسانہ یا مختصر افسانہ کم سے آدھے گھنٹے میں پڑھا جانے والا ایسا قصہ ہوتا ہے جس میں کسی ایک واقعے یا زندگی کے کسی ایک پہلو کو اختصار اور دل چسپی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ افسانے کے اجزائے ترکیبی میں: پلاٹ، کردار، نقطہ نظر یا مرکزی خیال، نمکالہ، آغاز و اختتام اور اسلوب بیان شامل ہیں۔

۳۔ انٹرنیٹ سے مختلف اداروں کی ویب سائٹس سے مختلف مقاصد کے لیے مرتب دفتری و عدالتی مواد (مختلف فارم، رجسٹری برائے کرایہ، تقرر نامہ، ملازمت کی درخواست، نکاح نامہ، عرضی، عدالتی حکم نامہ، ضمانتی چکے وغیرہ) ڈاؤن لوڈ کریں اور ان کے متن کو پڑھیں تاکہ مقصدِ تحریر کی اہمیت سے واقف ہو سکیں۔ نمونے کے طور پر ایک عدد درخواست برائے ملازمت اور ضمانتی چکے دیا جا رہا ہے۔

[illegible][illegible]

۵۔ افسانہ ”نیا قانون“ پڑھنے کے بعد سعادت حسن منٹو کا افسانہ ”تماشا“ بھی پڑھیں اور استاد محترم / استانی صاحبہ کی رہ نمائی میں سعادت حسن منٹو کے طرز تحریر پر تبصرہ کریں۔

۶۔ افسانہ ”نیا قانون“ اور ”تماشا“ کے اجزا اور ادبی محاسن کی شناخت کرتے ہوئے دیگر طلبہ کے سامنے بیان کریں۔
۷۔ افسانہ ”تماشا“ اور نیا قانون“ کو پڑھ کر ان میں درج معلومات اور تصورات کی پیش کش پر تبصرہ کرتے ہوئے قارئین پر ان کے اثرات کا تجزیہ پیش کریں۔

۸۔ مترادف الفاظ

ایسے الفاظ جن کے معانی ایک جیسے ہوں، مترادف الفاظ کہلاتے ہیں: مثلاً: شب سے رات، آدمی سے انسان

❖ درج ذیل الفاظ میں سے باہم مترادف کی شناخت کریں اور ان کے جملے تحریر کریں۔

بہادر خیال شجر آغاز آسان پرانا



استاد محترم / استانی صاحبہ کی نگرانی اور رہ نمائی میں جماعت کے طلبہ اس افسانے کی ڈرامائی تشکیل کریں اور یوم آزادی کی تقریب میں ڈرامے کے طور پر پیش کریں۔

ہدایات برائے اساتذہ کرام

- طلبہ کو مختلف اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی امور کے متعلق آگاہ کریں۔
- طلبہ کو مختلف مباحثوں، سیمیناروں یا مذاکروں میں شرکت کے اصول و ضوابط اور آداب کی آگاہی دیں۔
- طلبہ کو کالم، خبر، رپورٹ، تبصرہ، تذکرہ اور تجزیہ کے تصور اور فرق سے آگاہ کریں تاکہ طلبہ کسی بھی رکی یا غیر رکی تحریر، دعوت نامے، تہنیت نامے کو تیار کر سکیں۔

